حقیقتِ توحید



مولانا امین احسن اصلاحیؒ

حقیقتِ توحید

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۲۶۸

نام کتاب	:	حقیقت توحید
مصنف	:	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
صفحات	:	۹۶
اشاعت		
ساتواں ایڈیشن	:	ستمبر ۲۰۲۲ء
تعداد	:	۱۱۰۰
قیمت	:	**-/۹۰ روپے**
ناشر	:	**مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز**

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵
فون: ۲۶۹۸۱۶۵۲، ۲۶۹۸۳۳۴۷
موبائل: 7290092401 واٹس ایپ: 7290092403
E-mail: mmipublishers@gmail.com
E-mail: info@mmipublishers.net
Website: www.mmipublishers.net

مطبوعہ : S.K. Enterprises, Tronica City, U.P

ISBN 978-93-93192-41-7

HAQEEQAT-E-TAHUEED (Urdu)
By: Maulana Ameen Ahsan Islahi
Pages: 96
Price: ₹90.00

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

ہم نے اپنے رسالہ ''حقیقتِ شرک'' میں وعدہ کیا تھا کہ توحید کے دلائل ایک مستقل رسالہ میں بیان کریں گے۔ یہ اس وعدہ کا ایفا ہے۔ اب یہ دونوں رسالے لاَ اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ کی شرح کے لیے ان شاء اللہ پوری طرح کفایت کریں گے۔ ہمارا مقصود ان رسائل کی تصنیف سے صرف یہ نہیں ہے کہ توحید اور رسالت اور معاد کے عقلی و نقلی دلائل بیان کر دیے جائیں بلکہ ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ یہ مطالب جن دلائل کے ساتھ قرآن حکیم میں بیان ہوئے ہیں ان دلائل کی وضاحت کی جائے تاکہ دین کے ان بنیادی مسائل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہ بھی کھلے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ اس پورے سلسلہ کا غور سے مطالعہ کریں گے وہ اس قرآنی علمِ کلام کی کلید پا جائیں گے۔ جو ہمارے متکلمین کی پیدا کی ہوئی تمام الجھنوں سے بالکل پاک ہے اور عقلِ انسانی سے بہ راہ راست اپیل کرتا ہے۔ نیز ان کا ذہن قرآن کے طرزِ استدلال سے مانوس ہو جائے گا۔ اور وہ اس کتابِ عزیز کے کثیر حصہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے، جس کے صرف چند اشارات ان صفحات میں سما سکے ہیں۔

اللہ اور اس کی صفتوں کے باب میں قرآن نے جو کچھ کہا ہے اور جن دلائل کے ساتھ کہا ہے ان سب کی تفصیل بہت طویل ہوتی۔ میں نے غایت اختصار کی راہ اختیار کی ہے۔ تاہم ہر باب میں وہ ضروری باتیں بیان کر دی ہیں جو کشودِ کار کے لیے ضروری ہیں۔ آئندہ اگر ان اوراق

پر نظرِ ثانی کی نوبت آئی توان شاء اللہ اس اجمال کو تفصیل کا رنگ دینے کی کوشش کروں گا۔

فلسفۂ جدید نے دلوں میں جو شک کے کانٹے چبھوئے ہیں، میں نے قرآن کی روشنی میں، ان کو ایک ایک کر کے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اب اس بات کا فیصلہ قارئین کر سکیں گے کہ اس کوشش میں مجھے کام یابی ہوئی ہے یا نہیں، اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک ہوئی ہے؟ مجھے صرف اس قدر امید ہے کہ جن لوگوں کو فی الواقع کوئی الجھن ہے، صرف ان کو اس رسالہ سے فائدہ پہنچے گا۔ لیکن جن لوگوں کا شک یا انکار محض ''نہ ماننے کی خواہش'' پر مبنی ہے ان کی بیماری کا علاج کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی ان کو شفا دے سکتا ہے۔ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔

اس رسالہ میں ہم نے عقیدہ ''وحدتِ وجود'' پر بھی بحث کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ ''توحید کے غلط تصورات'' کے عنوان سے ایک پوری فصل لکھنے کا ارادہ تھا لیکن اولاً تو ہم نے مسئلہ پر جس نہج سے گفتگو کی ہے اس سے خود بہ خود ساری غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، ثانیاً مختلف وجوہ سے یہ زیادہ صحیح معلوم ہوا کہ وحدتِ وجود پر قرآن حکیم کی روشنی میں، ایک علیحدہ رسالہ میں بحث کی جائے۔ اس مسئلہ نے جو غلط فہمیاں پیدا کی ہیں وہ اس قدر پرانی اور الجھی ہوئی ہیں کہ ان پر اس مختصر رسالہ میں ضمنی بحث بالکل ناکافی ہوگی۔

اس رسالہ میں شفاعت پر بھی ہم نے بحث نہیں کی ہے۔ اس پر گفتگو کے لیے مناسب مواقع ہمارے رسائل حقیقتِ رسالت اور حقیقتِ معاد میں آئیں گے۔

ان صفحات میں جو باتیں صحیح اور کار آمد ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہیں جس کی عنایت سے مجھے استاد امام مولانا حمید الدین فراہیؒ سے استفادہ کا موقع ملا اور جو باتیں غلط ہیں وہ میرے قصورِ فہم اور کوتاہیِ علم کا نتیجہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔

مقدمہ

یہ رسالہ ہمارے رسالہ حقیقتِ شرک کا تکملہ ہے 'حقیقتِ شرک' میں شرک کی حقیقت ہم نے اس قدر وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے کہ توحید کی حقیقت اس میں آپ سے آپ نکھر کر سامنے آگئی ہے ع بضدها تتبين الاشياء۔ اب توحید کی توضیح کے لیے کسی مستقل رسالہ کی ضرورت نہیں باقی رہ گئی تھی لیکن حقیقتِ شرک میں چونکہ اصلاً شرک کے اقسام وفروع کی تفصیل پیش نظر تھی اس وجہ سے اس میں دلائل توحید کے بیان کے لیے پوری گنجائش نہ نکل سکی۔ یہ رسالہ اس کمی کو پورا کردے گا اور یہ دونوں رسالے مل کر اب ان شاء اللہ شرک وتوحید کے باب میں پوری طرح کفایت کریں گے۔ و بيد الله التوفيق۔

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بہ طور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کے اولین مخاطب

قرآن مجید کے اولین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی جیسا کہ حقیقتِ شرک میں ہم بیان کرچکے ہیں، خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسمٰعیل تھے، جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا اقرار کرتے تھے، ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہ تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اس کی تمام صفاتِ حسنیٰ کے قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک، چناں چہ قرآن مجید نے ان گروہوں سے ان کو منکر خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلمات کو

بنیاد قرار دے کر ان کی ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انھوں نے ان مسلمات سے بالکل متناقض اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے 'حقیقتِ شرک' میں بیان کیا ہے دنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصوّر ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصور کے ارد گرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمہ کو حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوتی نہ ایمان و عمل صالح کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہد حاضر کی پیداوار ہے۔ اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

یہی وجہ ہے کہ قرآن اثباتِ الوہیت کے باب میں، ہمارے متکلمین کے طریقہ پر، اثباتِ باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلامِ مؤثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا۔ اور وہ حکمتِ بالغہ جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر متکلمانہ جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا بڑا حصہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا۔ بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ ان کے سامنے کھول کے رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کر لیں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیتِ جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن چوں کہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکزِ دین اور مبدائے ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آجائے اس وقت تک نہ اس کائنات کا معمہ حل ہو سکتا، نہ آدمی کا کوئی قدم آگے اٹھ سکتا، نہ حق و باطل اور بر و اثم کے اصول قائم ہو سکتے، نیز قرآن مجید ایک ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے، کسی خاص قوم یا کسی عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس کو بنی نوع آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے، اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوب

بیان اختیار فرمایا جس سے ایک طرف اللہ کا تمام صفاتِ کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہو، تاکہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصوّر سے قاصر ہیں، اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے۔ ان کے لیے جابجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس کے صفاتِ حسنیٰ کے تصوّر میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفاتِ کمال سے متصف تو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں۔ ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے، جو انھوں نے اپنے اقرار سے بالکل مخالف اپنے اندر جمع کر لی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں۔ ہرچند وہ خدا کے منکر نہیں تھے لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت الجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجودِ باری کے باب میں بھی ان کو یقین و بصیرت حاصل ہو سکے اور اس کی صفات کے تصوّر میں بھی ان کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہو جائیں۔ چناں چہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے جو منکر اور ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں الجھنیں ہیں۔ استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو توریت اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انھوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں۔ ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجت ہے، جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی عملی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں۔ بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب بنی اسمٰعیل بھی ہیں۔ لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

قرآنی استدلال کی اساس

اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبداء و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو دلائلِ انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں:

۱- وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعتراضات پر مبنی ہے۔اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً جو قومیں کسی الٰہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے، یا جو قومیں الٰہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں، یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں، یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں۔ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲- دوسری قسم دلائل آفاق کی ہے۔اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں، اور جو درحقیقت انھی صفات کے مظاہر ہیں جن سے خالقِ کائنات متصف ہے۔

۳- تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان واذعان ہے، جو فاطر السموات والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہوجاتے ہیں۔ لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر متنبہ کرتی رہتی ہے۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح فرمائی ہے۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۝

(حٰم السجدہ: ۵۳-۵۴)

"ہم ان کو اپنی دلیلیں کائنات میں اور خود ان کے اندر دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہوجائے کہ وہی حق ہے۔ کیا تیرے پروردگار کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر ہے۔ آگاہ! وہ اپنے رب سے ملنے کے بارے میں شک میں ہیں۔ آگاہ! وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔"

اس آیت میں دعویٰ روز جزاء اور قیامت ہے۔ اس پر پہلے دلائل آفاق کا حوالہ دیا ہے، پھر دلائل انفس کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورۂ ذاریات میں ہے:

وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ۙ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَ فِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۝ۧ (الذاریات: ۲۰-۲۳)

"اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور تمھارے نفوس کے اندر بھی ہیں، کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتی ہیں۔ اور آسمان میں تمھاری روزی اور وہ چیز بھی

جس کی تمھیں دھمکی سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین کے رب کی قسم یہ بات واقع ہو کے رہے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تمھارے لیے ایک بات کا بول دینا۔''

یہاں بھی دعویٰ جزاء و سزا کا وقوع ہے۔ ان آیات سے اوپر اسی دعویٰ پر آسمان و زمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کے فاطر کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دنیا کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے۔ اس کائنات کی سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگزشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی برائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا۔ پھر ایک جامع بات فرمائی، کہ آسمان و زمین اور تمھارے نفوس کے اندر اس کی دلیلیں موجود ہیں۔ یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آسمان و زمین کے رب کی قسم بہ طور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں قرآن مجید سے ہم نے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرما دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی، توحید، رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے اپنے محل میں آئے گی یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

بعض ضروری تنبیہات

لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علیٰحدہ علیٰحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے، اسی طرح قرآن میں ان کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرزِ استدلال اور اس کی اساسِ استدلال میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے بحث پیش کی گئی ہے۔ کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں، کہیں آفاق کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ کہیں ان میں سے دو کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کہیں تینوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی

اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں تو صرف توحید پر استدلال ہے، کہیں صرف معاد پر۔ کہیں ان میں سے دو جمع کر دیے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقدِ بصیر کا کام ہے۔ پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے، اس وجہ سے جو لوگ استدلال و نظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں، وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے، جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ بلاشبہ اہل ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرما دینا ہی دلیل ہے، لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آتا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا، جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو۔ چناں چہ قرآن نے، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کو بہ طور ماخذِ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق و انفس کے قوانین و سنن سے دکھائی ہے، اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے، قرآن انھی حقائق کا داعی ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تا کہ شریعت اور عالمِ آفاق اور عالمِ انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں، اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں، ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں ان امور پر تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اوّلین مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور ان کی خصوصیات و حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، یا قرآن کے طرزِ استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس اہمیت سے بے خبر ہیں، یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا سارا استدلال ظنی اور الزامی قسم کا ہے، اس کو فلسفیانہ برہانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ یونانی علوم سے متاثر و مرعوب ہوئے وہ اسی سوءِ ظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے، وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو (العیاذ باللہ) مزبلہ سمجھ کر آئے جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، برہانیات کے جواہر ریزوں کی امید نہ تھی۔

قرآن کی نسبت اسی قسم کی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ وسائنس سے مرعوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجے کے دماغوں کو اپیل کرسکتی ہے، خواص اور عقلاء کے مبلغِ ادراک سے اس کا استدلال العیاذ باللہ فروتر ہے۔ ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں سے نمودار ہوا ہے۔ ہم اس رسالہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تا کہ دین کی حجت واضح ہو۔

اس رسالہ میں مباحث کی ترتیب

(توحید کے عمومی دلائل)

۱- دلائل آفاق

۲- دلائل انفس

(توحید کے خصوصی دلائل)

۳- دلائل بہ لحاظ مسلمات مخاطب

۴- پچھلی فصلوں کا خلاصہ

۵- عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر

۶- عقیدۂ توحید کی اہمیت دین میں

یہ رسالہ چوں کہ 'حقیقتِ شرک' کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس رسالہ کا مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے، بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں، وضاحت کے ساتھ 'حقیقت شرک' میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں ان کو دلوں میں جگہ دے، اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر کو محو فرما دے۔

توحید کے عمومی دلائل
دلائلِ آفاق

یہ دنیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر بلکہ ایک ایسے معبود حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جن کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور جن کے بارے میں ہماری عقل اور ہماری فطرت مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے۔ ان امور کو قرآن کی زبان میں آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اس فصل میں بہ قدرِ ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱- کائنات کا حسن و جمال

سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پروا گزر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے اردگرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں

جلوے دیکھتا ہے دفعتہً اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے معمور دنیا خود بہ خود وجود میں آ گئی، اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ

''بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

یعنی صرف اسی بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DESIGNER) ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ بہترین خالق ہے، یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت اور کمالِ خیر و برکت کا نمونہ ہے۔ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔

ظاہر ہے کہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی۔ ممکن تھا، کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن، یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کی حس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمالِ قدرت، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے متصف ہے۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَ زَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ (ق:٦-٨)

"کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کیسا ہم نے اس کو بلند کیا اور سجایا اور کہیں اس میں دراڑ نہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں لنگر انداز کر دیے پہاڑ اور اگائیں اس میں ہر قسم کی خوش منظر چیزیں۔ بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے کے لیے ہر متوجہ ہونے والے بندے کے دل میں۔"

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلوؤں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے۔ اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دنیا کا مشاہدہ خود بہ خود انسان میں خدا اور اس کی صفات حسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِىْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ۝

(واقعہ: ۷۱-۷۳)

"بھلا دیکھو تو اس آگ کو جس کو سلگاتے ہو کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا ہے، یا ہم اس کے اگانے والے ہیں؟ ہم نے اس کو بنایا ہے یاددہانی اور فائدہ اٹھانے کی چیز مسافروں کے لیے۔"

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادّی ضرورت ہی کو نہیں پورا کرتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی تخلیق میں حسن و خوب روئی اور کمال صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے متنبہ بھی کرتی ہیں اور متنبہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے بلکہ ان کا اصلی وظیفہ یہی ہے۔ چناں چہ آیت میں 'تذکرۃ' کا لفظ 'متاع' کے لفظ پر مقدم ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاددہانی ہے۔ سامان معیشت ہونا ان کا ایک مزید فائدہ ہے جن لوگوں کی حس باطن بیدار ہوتی ہے ان کو اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی لذات کے سوا ان کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا، ان کی آنکھیں خورد بینوں اور دور بینوں سے مسلح ہونے کے باوجود، اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں جو فی الحقیقت ہر شے کے اندر سب سے زیادہ ابھری ہوئی

ہے۔ چناں چہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چو پایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں لیکن سنتے نہیں، آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں، دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔

یہ رنگا رنگ جلوے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفات جمال و کمال سے متصف ہے۔ کیوں کہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے۔ بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے۔ اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قوئ اور قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے (وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ٘) نیز فرمایا (یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ٘ۙ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰىکَ فَعَدَلَکَ٘ۙ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ٘) اس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا بلکہ لطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کیے اور مشام نوازی اور نظر بازی کے لیے پھول بھی کھلائے اور چمن بھی اگائے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ٘ۙ فِیْهَا فَاکِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ٘ۖ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ٘ۚ (اور زمین کو بنایا مخلوق کے لیے، اس میں میوے ہیں اور کھجور ہیں غلاف دار، اور اناج ہیں بھس والے اور پھول ہیں)

ظاہر ہے کہ یہ صرف خلق نہیں بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے۔ صرف بخشنا نہیں بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمالِ ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدے سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن جب ہم ان کے اجزاء انفرادی وجود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایسی سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے۔ جس طرح ہم ایک حسین، متناسب الاعضاء اور خوب صورت چیز کو

دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزاء کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیئے کی دوکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں ہر چیز بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی۔ کیوں کہ مختلف ارادوں، اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲- کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق

دوسرا اہم اور قابلِ توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور ان کی باہمی سازگاری ہے۔ اس دنیا کے مختلف اجزاء میں، جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں، اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات و صفات کا حامل ہے۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی و جسمانی اتصال رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب و مرغوب ہے بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کا تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت

و برودت، سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انھی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت و مرد میں سے جس طرح ایک کا تنہا وجود بے غایت ہے اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا ہی اس وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدین ہی میں نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشو ونما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آ کر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش ونگہ داشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط و نظم کے ساتھ ہوئے تب کہیں جا کر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقاء آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبّر ہستی (Mind) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی اور ان کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (Accident) ہے، آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقاء بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا کوئی عاقل ایک لحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند و پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے اور ہر ایک کا بہ طور خود ارتقاء ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا اور پھر بالکل اتفاق ہی سے یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے؟

یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم وقوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم وقدرت اور ربوبیت وحکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم وحکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط واتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین وآسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک و متصرف ہے۔ کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان وزمین کے الگ الگ ناظم و مدبّر ہوتے، یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی یا خیر وشر اور نور وظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزاء میں یہ زوجین کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ قرآن نے اس دلیل کو مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے۔ ہم بہ طور مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذاریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَفِرُّوٓا إِلَى اللّٰهِ ۖ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۖ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ (الذاریات: ۴۹-۵۱)

"اور ہم نے ہر چیز میں سے پیدا کیے جوڑے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ کی طرف بھاگو میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک مت بناؤ۔ میں تمھارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔"

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے۔ معاد پر استدلال یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ ہمارے رسالہ، حقیقتِ معاد، میں آئے گی۔ توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود وبقا اس کے اضداد کے توافق وسازگاری سے ہے۔ اور اس سے

بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے جو ان کے اختلاف کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اختلاف جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہر کا اختلاف ہے۔ اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں۔ ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تحتِ تصرف اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس دلیل کی تفصیل سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(البقرہ: ۲۱-۲۲)

''اے لوگو! اپنے مالک کی بندگی کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ اس کے عذاب سے محفوظ رہو۔ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کیے پھل تمھاری روزی کے لیے۔ پس اللہ کا شریک نہ ٹھیراؤ۔ دراں حالے کہ تم جانتے ہو۔''

یعنی جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے، اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے۔ ان اضداد اور عناصرِ مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبّر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے تصرف میں لائے۔ یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے:

اِلٰـهُکُمۡ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ۝ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (البقرہ: ۱۶۳-۱۶۴)

''اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، رحمٰن اور رحیم یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت، روز وشب کی آمد وشد، اور کشتی میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نافع چیزیں لے کر چلتی ہے اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر طرح کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور بادلوں میں، جو آسمان وزمین کے درمیان مسخر ہیں، دلیلیں ہیں (توحید کی) سمجھنے والوں کے لیے۔''

سورۂ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا ہے:

وَاللّٰهُ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۝ وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ۝ وَ مِنۡ ثَمَرٰتِ النَّخِیۡلِ وَالۡاَعۡنَابِ تَتَّخِذُوۡنَ مِنۡهُ سَکَرًا وَّ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ۝ۙ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِهَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهٗ فِیۡهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوۡمٍ

یَتَفَکَّرُوْنَO (النحل: ۶۵-۶۹)

''اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی اور اس سے زندہ کیا زمین کو اس کے مرجانے کے بعد بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سنیں۔ اور تمھارے لیے چوپایوں کے اندر بھی غور کرنے کی جگہ ہے۔ ہم تم کو پلاتے ہیں ان چیزوں کے اندر سے جو ان کے پیٹوں کے اندر ہیں، گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ، پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار، اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم تیار کرتے ہو نشہ اور اچھی روزی، بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں، اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ بنا پہاڑ کے اندر چھتے اور درختوں میں اور ان میں جن کو ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں، پھر پھل پھل کا رس چوس اور چل اپنے رب کی ٹھیرائی ہوئی راہوں میں اطاعت کے ساتھ نکلتی ہے اس کے پیٹ سے پینے کی چیز جس کے رنگ مختلف ہیں اور جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بے شک اس کے اندر ایک دلیل ہے، ان لوگوں کے لیے جو غور کریں۔''

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے، اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے، اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں، اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے، آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کرلیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اور درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنالیتی ہیں، پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں، جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف، انسان ان کو پیتا ہے ان سے لذّت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفاء بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ آسمان وزمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں۔ جس دنیا کے اتنے بعید اجزا کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزا کی

کشاکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہوسکتی ہے، نہ مختلف ارادوں کی رزمگاہ ہوسکتی۔ ظاہر بیں نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم کا ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۗ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۗ (فاطر: ۱۲-۱۳)

"اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں اور پینے کے لیے خوشگوار ہے اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے اور تم دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور پہننے کے لیے زیور نکالتے ہو اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو ان میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کر سکو اور تاکہ اس کی شکر گزاری کرو۔ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو ہر ایک، ایک وقت مقرر تک کے لیے چلتا ہے۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔"

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے۔ کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں، پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو۔ دونوں اپنی صفات و

خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے۔ بہ ظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کے بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری، یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض نہ ماننے کی خواہش پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

۳۔ضد سے ضد کا وجود

اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو۔ اس کائنات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے آگ کی چنگاریاں جھڑتی ہیں۔

جَعَلَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا۔

''اور سرسبز درخت سے تمھارے لیے آگ بنائی۔''

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ۔

''موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت نکالنے والا ہے۔ زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے، وہی اللہ ہے تو کہاں بھٹکے جاتے ہو؟''

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کر سکتے، یہاں آ کر بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی

ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرت کاملہ سے تصرف کرتی رہتی ہے اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی اور اس کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا توجیہ کریں گے؟ اور ہرے بھرے درخت سے تروتازہ پھولوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے؟ کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً ایک ایسی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا ہے، جو ان تمام سننِ طبیعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴- متحدات سے مختلفات کا وجود

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی ہے۔ ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے۔ سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے، پھر درجہ بہ درجہ اس کے اجزا میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع آلہہ کے تعدد و تنوع کی دلیل نہیں ہے۔ زمین ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے، ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں تاہم نباتات بے شمار قسم کی اگتی ہیں، پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں، پھلوں کی شکل و صورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ و بو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے۔ ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زائد انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنہ پیدا ہوتا ہے۔

وَ فِی الۡاَرۡضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ زَرۡعٌ وَّ نَخِیۡلٌ صِنۡوَانٌ وَّ غَیۡرُ صِنۡوَانٍ یُّسۡقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۟ وَ نُفَضِّلُ بَعۡضَہَا عَلٰی بَعۡضٍ فِی الۡاُکُلِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝ (الرعد: ۴)

''اور زمین میں پاس پاس کے ٹکڑے ہیں اور انگور کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجور ہیں اکہرے اور دوہرے، ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں تاہم پھل میں ہم ایک کو دوسرے پر بڑھا دیتے ہیں۔ بے شبہ اس میں نشانیاں ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔''

یعنی جس شخص میں عقل ہوگی لازماً اس سے اس کو متنبہ ہوگا۔ اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کوئی خالق ہے جو کمالِ حکمت وقدرت اور کمالِ رحمت کے ساتھ تصرف فرمارہا ہے، اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لاشریک لہ ہے کیوں کہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعہ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوّعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے تو اس کائنات کی اس گونا گوئی کو آلہہ کے تعدّد کی دلیل کیوں ٹھیرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہوگی کہ یہ سارے تنوّعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم وقدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازے کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵- مظاہر کائنات کی تسخیر

توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز ومقہوریت اور انقیاد واطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہیں کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن وعظمت کے باوجود اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق ورعد اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظام حکمت کے ماتحت مقہور ومسخر ہیں۔ تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر فرماں روا ہے۔ اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر آمر ومتصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اس کا جواب مشرک عربوں کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز وحکیم

ہے۔ لَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ الۡعَزِيۡزُ الۡعَلِيۡمُ ۝ (اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا تو وہ جواب دیں گے ان کو عزیز وعلیم نے بنایا ہے) کیوں کہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ اس کائنات کی خالق کوئی ایسی ہی ذات ہوسکتی ہے، جو عزت وکبریائی اور علم وحکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو۔

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں، ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے۔ حالاں کہ ذلت واطاعت، سجود وہبوط اور کسوف وخسوف کے آثار، جو ہم ان میں دیکھتے ہیں دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال وتفصیل کی مختلف شکلوں میں، قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حسن مجادلہ کی بہترین تصویر ہے:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا‌ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَئِنۡ لَّمۡ يَهۡدِنِىۡ رَبِّىۡ لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمۡسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّىۡ هٰذَاۤ اَكۡبَرُ‌ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتۡ قَالَ يٰقَوۡمِ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِكُوۡنَ ۝ اِنِّىۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِىَ لِلَّذِىۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِيۡفًا‌ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ‌ۚ ۝ (الانعام: ۷۶-۷۹)

"جب اس کو رات نے ڈھانک لیا اس نے ایک ستارے کو دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے

جب وہ غروب ہو گیا کہا میں غروب ہونے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب چاند کو چمکتا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے، جب ڈوب گیا، بولا اگر میرے پروردگار نے میری رہبری نہ فرمائی تو لازماً میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ بڑا ہے جب وہ بھی ڈوب گیا کہا اے میری قوم کے لوگوں میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس ذات کی طرف پھیرا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

۶- کائنات کی محکم تدبیر

اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا اس کائنات کے ہر گوشہ میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں، بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ، معلوم ہوتا ہے، کہ اس کائنات کی ہر قوت شترِ بے مہار کی طرح اپنے رُخ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے، نہ وہ کسی نظام قاہر کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع، لیکن پھر دفعۃً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے۔ کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بعض بڑے بڑے اجرامِ سماویہ کسی خاص رُخ پر بڑھ چلے، اور اگر وہ اسی رُخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارا کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا۔ چناں چہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرینِ فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرمِ سماویہ سے ٹکرا جائے گی۔ لیکن جب وہ متعین وقت آیا دفعۃً اس جرم نے اپنا رُخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دنیا کے بالکل سر پر آ گیا تھا یکا یک دفع ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قویٰ اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے؟ جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھیل دیتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بھی بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقلِ بشری اور قلبِ انسانی کو ان جوابات سے تشفی وطمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يُمۡسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا لَئِنۡ زَالَتَا اِنۡ اَمۡسَكَهُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا۔ (اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو کوئی اس کے بعد ان کا تھامنے والا نہیں ہے۔ بے شک وہ نہایت حلیم اور بخشنے والا ہے) اور کون ہے جو اس جواب کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس کنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر غور کریں تو وہاں بھی یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علم بردار پیدا ہوتے ہیں، اس پر ایک باطل نظامِ اخلاق، ایک باطل نظامِ معیشت، اور ایک باطل نظامِ سیاست کے ردے چڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے غلبہ کے نیچے دب کر صالح اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے۔ تاہم اس نظامِ باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے، اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی از سرِ نو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظامِ باطل کو اس طرح جھنجھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا اسۡتَيۡــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا جَآءَهُمۡ نَصۡرُنَا۔

”(یہاں تک کہ جب انبیاء قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور قوم کے لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کو جھوٹ عذاب کی دھمکی دی گئی تھی، ہماری مدد آ جاتی ہے)۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ

”(اور ہلا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ پکار اٹھتے ہیں انبیاء اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ آگاہ! اللہ کی مدد قریب ہے)۔“

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ یہ دنیا آپ سے آپ عالمِ وجود میں آئی اور خود بہ خود قائم ہے یا یہ گمان کر سکے کہ یہ مختلف قویٰ اور عناصر کی ایک رزمگاہ ہے اور یہ قویٰ اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیرِ نگیں نہیں ہیں؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے، اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے؟

۷۔ ہر نظمِ اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو

اس عالم کا مجرد قیام اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصوّر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں۔ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیمِ اجتماعی کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج اور انارکی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہ ہر حال یہ امر قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزا پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں، لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی، سنبھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی و صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر شخص کر رہا

ہے جو اس بادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے؟ کیا مشرکین کا یہ عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ آلہہ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم و مدبّر صرف اللہ واحد و قہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت و انتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیوں کر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں۔

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ○ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ (انبیاء:۲۱-۲۲)

”کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھیرا لیے ہیں۔ وہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ عرش کا مالک، پاک ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔“

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّا بْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا○ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا○

(بنی اسرائیل:۴۲-۴۳)

”کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے سے منازعت کی راہ ڈھونڈ ھتے۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ کہتے ہیں۔“

۸-حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ

بعض قوموں کو خدا کی توحید بلکہ خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ، دنیا میں شر و باطل کے وجود سے پیش آیا ہے۔ ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مکھن تھا وہ ان کو نظر نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز و رحیم اور پاک و قدوس خدا کے وجود ہی سے منکر ہو گئیں، یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے۔ اور وہ اس کو پیدا کر کے، دور بیٹھے ہوئے اس کے مصائب و شدائد اور اس کے دکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یا پھر یہ کیا کہ خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ٹھیرا لیے اور دنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزمگاہ بنا دیا۔ یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلتِ تدبر، قلتِ صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہوئی۔ نہ انھوں نے اس دنیا کے اصلی مزاج و قوام کو پہچانا اور نہ حق و باطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم اس کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس دنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ۝

(رعد: ۱۷)

''اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پس وادیاں ایک اندازہ کے ساتھ بہہ نکلیں، پس سیلاب کے اوپر جھاگ ابھر آیا اور اسی طرح کا جھاگ اس چاندی میں ہوا ہے جس کو آگ میں پگھلاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا کوئی اور سامان۔ اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا ہے تو جھاگ اُڑ جاتا ہے باقی جو لوگوں کے لیے نفع بخش ہے، وہ زمین میں اٹک جاتا ہے۔ ایسی ہی اللہ مثلیں بیان کرتا ہے۔''

یعنی اس دنیا کا اصلی مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو نہیں ہضم کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو نہیں ہضم کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے۔ بارش ہوتی ہے، اور وادیاں بہہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ ابھر آتے ہیں۔ پھر پانی زمین میں ٹک جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے۔ یہی اس دنیا کا اصلی مزاج ہے۔ اس میں مجرد باطل کا وجود نہیں ہے۔ باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر۔ جس طرح صالح درختوں اور صالح جان داروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے۔ تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو حالاں کہ یہ اعتراض محض تمھاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے۔ قدرت ہر گوشہ میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے۔ اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق و طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس دنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم و ثابت کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّا تَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ۝ (انبیاء: ۱۶-۱۸)

"اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کرنے کے لیے۔ اگر ہم کھیل بنانا چاہتے تو اپنے پاس ہی سے بناتے، اگر ہم یہ کرنے والے ہی ہوتے۔ بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال لیتا ہے اور باطل دفعۃً نابود ہو جاتا ہے۔ اور تمھارے لیے ہلاکی ہے ان باتوں کے سبب سے جو تم بیان کرتے ہو۔"

اس دنیا کے اندر جو مصائب و آلام ہیں وہ بھی اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزمگاہ ہے۔ قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم و قدیر خدا کی مشیت و حکمت کے تحت اور ان کو قوموں کے اخلاق و اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں۔ بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی سرکش قوم جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے، ان کے ذریعہ سے تباہ کر دی جائے۔ بعض حالات میں اہلِ حق بھی ان میں سے کچھ حصہ پاتے ہیں تاکہ ان کے ایمان و عقیدہ اور صبر و عزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادّی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات و آلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ اس دنیا میں کون و فساد اور رحمت و نعمت کے الگ الگ دیوتا ہیں، بلکہ صرف ایک ہی ہے جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے جیسا کہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے۔ یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے۔ یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے، اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی راہ اس کی فطرت کی راہ ہے، اور اس پر اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔ لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیوں کہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اس کی مشیت کے تحت ہے۔ اور یہ لازم نہیں کہ

جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو۔ وہ اتمامِ حجت کے لیے ان کاموں کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیل دیتا ہے جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ پس خیر ہو یا شر کل اللہ ہی کی جانب سے ہے کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ نہ جبر محض کا دعویٰ صحیح ہے نہ اختیارِ مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی ان شاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے۔ شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے۔ پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے نیز یہیں سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی، اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں، ایک ہی ہے جس کے تحتِ تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹- اشارات

اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں، اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بیں نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے صناعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور اعتبار و تنبہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہلِ عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو لوگ عرب کے خطباء اور شعراءِ جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ منزلِ یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں، اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی مؤثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا دل بھر

آتا ہے۔ قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوقِ نظر جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ ''توسُّم'' ہے صرف دیار یار کے آثار و نشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجہ کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو شہ دی اور کائنات کے آثار و عجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرء القیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کر سکتی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اٹھیں۔

یہ اشارات قرآن کے تمام بنیادی مسائل توحید، رسالت، معاد کے سلسلہ میں نمایاں کیے گئے ہیں۔ یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تا کہ یہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے۔(۱)

سورۂ رعد (۱۵-۱۶) میں فرمایا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۩ ۝ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ (الرعد: ۱۵-۱۶)

''اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں راضی خوشی اور مجبوراً اور ان کے سائے صبح و شام۔ پوچھو کون ہے آسمانوں اور زمین کا رب؟ کہو، اللہ۔''

''طَوْعًا وَّ كَرْهًا'' کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے

---

(۱) اس کائنات کے اشاراتِ حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے۔ جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں، مثلاً اگر تثلیث پیش نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشہ سے تثلیث نمایاں ہوگی یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی سب مثلث ہوں گی، میز، قلم دان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہوگی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبر کی نظر ڈالے وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے ''ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار''، لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے۔

ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں لیکن جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے انھیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے، اوراس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرمادی کہ ان کے سائے صبح وشام خدا کا سجدہ بجالاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے۔ یا ایک ساجد خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے۔ اور پھر ایک شب زندہ دار بندے کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے۔ پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بالتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے جس طرح ایک مصلّی سجدہ سے قیام کی حالت میں آگیا ہو۔ اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ ہی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ صورتِ حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع وسجود میں ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سجدۂ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے۔ آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ، مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی۔ پھر اگر ایک انسان، جو ایک بااختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے، لیکن اس کے سارے وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے۔ یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کر رہا ہے لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ پر عامل ہے۔ عالم اختیار اور عالمِ تکوینی کی یہ بے ربطی، ''من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید'' کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ
وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ ○ (النحل:۴۸)

”کیا انھوں نے نہیں دیکھا ان چیزوں کی طرف جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ لوٹتا ہے ان کا سایہ دہنے اور بائیں سے سجدہ کرتا ہوا اللہ کو، اور وہ اس کے آگے ذلیل ہیں۔“

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جو قومیں صغریٰ و کبریٰ کی ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں، ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے، لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی۔ یہ چیز تربیتِ عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے۔ ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں طاری کر سکتے، جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈروں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر کر سکتے ہیں۔

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

توحید کے دلائل اَنفس میں

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے۔ پھر جب عقل وتمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک مؤخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایتِ قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل آفاق کی بنیاد درحقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان وزمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ وتار ہے، اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ ظلمات ہوتا۔ چناں چہ جو بلید آسمان وزمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے، اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دل نشین بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

(الذاریات: ۲۱،۲۰)

''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمھارے نفوس کے اندر بھی، کیا تم نہیں دیکھتے؟''

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالمِ اَنفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱- عہد فطرت

توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ ''حقیقتِ شرک'' کی آخری دو فصلوں میں کی ہے، یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہاں ہم نے علمائے سائنس کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصوّر پیدا ہوا۔ اور یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسبابِ زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے۔ اور نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گزاری کا جذبہ اور تصور پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ نہ تو مجرد الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلّی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں، انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم، دوسرے لفظوں میں، عدل سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے دوسروں کے لیے ناپتا ہے، اور اسی جذبہ عدل نے

خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدلِ فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حقِ واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلاوجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں، ظلم عظیم، یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے، کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔ اس عدل کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَ اَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۚ شَھِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ ۙ (الاعراف: ۱۷۲)

"اور یاد کرو جب لیا تمھارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان کے اوپر۔ کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ہاں ہم گواہ ہیں۔ یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔"

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے 'حقیقتِ شرک' کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے یہاں نقل کرتے ہیں:

"بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے؟ ہمیں تو نہ اس الست بربکم کی کوئی خبر ہے نہ اس 'بلیٰ' کی یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد بہر شکل ہر ابنِ آدم پر حجت ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر، اور کتنے دکھ اٹھا کر، نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جاں کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت

اور تربیت ونگہ داشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے، وہ خود کم کھاتا ہے تا کہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تا کہ بچہ کو آرام پہنچے، وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تا کہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق وفرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمے داری کی کوئی خبر نہیں ہے، میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے، تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیوں کہ وہ ایسے حق اور ذمے داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بہ خود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت، اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔"

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظتِ حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت ونصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے، اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم وقابلیت، وقت اور آزادی جان اور مال میں اس کو شریک کریں، اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا، لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمے داری اور اس کے حقوق وفرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں، یا اسی طرح ایک

آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بہ دولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر ایک سلطنت کا شہری ہے۔ لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے، اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا..... کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک 'میثاق غلیظ' کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی۔ اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی، کیوں کہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔"

یہاں تک کہ اس استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں، اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کر دیں، ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں، ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں، اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں، ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں، اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ احساس اور ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

"اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدۂ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہدِ ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں، اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمے داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو، جس نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے، اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکر گزاری کی جائے اور اس شکر گزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھیرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۝ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ قَالَ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ۝ وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ ۝ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ ۝ وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۝

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝

(الشعراء: ۶۹-۸۲)

''اور سناؤ ان کو ابراہیم کی سرگزشت جب اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا یہ تم لوگ کس چیز کی پوجا کر رہے ہو! بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ کہا ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم اور تمھارے اگلے بزرگ۔ یہ تو سب میرے دشمن ہیں مگر عالم کا رب جس نے مجھے پیدا کیا، اور پھر ہدایت بخشتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا پھر زندہ کرے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن بھی میرے گناہ بخشے گا۔''

یعنی ایک منعم ہستی، جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں، جس نے ہمیں کھلایا پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہوگا، بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکرگزاری کی صورت میں ادا کریں، اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھیرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلمِ عظیم ہے۔

۴۔ علم و یقین کی فطری طلب

انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں علم، اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرحِ صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس بات کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز و انجام کے بارے میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو، وہ اپنی ہستی کی غایت اور اس کے نیک و بد سے بالکل

بے خبر ہو۔ کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کرلے اور اسی پر جم جائے۔ لیکن یہ نہیں کرسکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے، انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پاکر کسی غلط چیز کو ہی اختیار کرلیا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پرواہ ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے۔ اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جاسکتا ہے لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جاسکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (آگاہ! صرف اللہ کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے) یہی وہ روشنی ہے، جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمان وزمین کی روشنی ہے) اس کو پا لینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصوّر کرسکتا ہے، اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کرسکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہوسکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارے میں اعلیٰ وجہ البصیرۃ ایک فیصلہ کرسکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا۔ اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے

حواس غلطی کر جاتے ہیں۔ لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بہ تکلف انسان نے اختیار کی ہے ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک لَا اَدرِیْ کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور اپنے باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے، اور انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے الا آں کہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفاتِ کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بھی بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گم راہی ہے کیوں کہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امرِ واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرت انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○ وَ مَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ○

(المومنون: ۱۱۶-۱۱۷)

''پس اللہ بادشاہِ حقیقی بلند و برتر ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، باعظمت عرش کا مالک ہے، اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔''

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کو ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھیراتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیوں کہ مشرک ایک خدا کو تو بہ ہر حال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے، باقی رہے شرکاء و انداد جو اس نے اپنے جی سے فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کے تردید کے دلائل کی۔ ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳- فطرتِ انسانی کا علو

توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرتِ انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہش مند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساسِ برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی اور برتری کا

احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمے داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ میں بیان ہوئی ہے، لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ کبھی اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰی کبھی اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے، کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی وتری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے۔ لیکن اس احساس برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں، اور قابلیتیں بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ بندگی کی صف میں آ کر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قویٰ اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان وزمین کی مالک ومدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کمتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے۔ اس میں اصلی ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے۔ لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت وتدبیر سے یہ سارا انظام چل رہا ہے۔ یہ کبرِ نفس اور علوء کا داعیہ انسان میں اتنا سخت وشدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعتراف حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظر سورۂ بقرہ میں موجود ہے جو مدعی تھا کہ ''میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں اس لیے میں ہی رب ہوں۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ ''اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کر دو'' اس کے عجز کو بالکل بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضے سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا، لیکن کبرِ نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن

جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم اور مدبر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پالیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی مایحتاج پالینے کے باوجود در در صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دناءت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل و بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزتِ نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالے اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ ایک چھنال ہے جس نے اپنا جوہرِ عفت اور جمالِ غیرت بالکل کھودیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا ہے کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کررہا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پر ہوگیا۔ اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہوجائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمھیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو۔ مجھے اس سے معاف رکھو۔

تحمل اصحابی لم یجدوا وجدی

و للناس اشجان ولی شجن وحدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں اشارہ فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝

(یوسف:۳۸-۴۰)

”اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی، ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھیرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ اے میرے قید خانہ کے ساتھیو! کیا یہ بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک ہی اللہ جو سب کو قابو میں رکھنے والا ہے؟ نہیں تم پوجتے ہو اس کے سوا مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ نہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی فطری دین ہے مگر اکثر نہیں جانتے۔“

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی روح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی عزت و حرمت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا۔ لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل

مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان اپنے نفس کے علو کے باوجود اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے مانے بغیر اس کی فطرت کا خلا پر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہترین کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد وقہار کی اطاعت کی جائے؟ ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اس کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اس ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اسی علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَآءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلاً ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الزمر:۲۹)

”اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ شکر اللہ کے لیے، بلکہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔“

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا تو، پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے؟ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد فطرتِ انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمدللہ، یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس

کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ انسان کے اسی علوئے فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے:

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبۡدَہٗ۔

''کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ہے؟''

یہی علوئے نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعۃً رفعت و عزت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ۔

اور دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ۟ؕ السجدۃ (الحج:۱۸)

''کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے انسانوں میں سے بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب واجب ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے تو اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔ اور بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔''

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیاءِ کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴-انسان کا ضعف وافتقار

چوتھی چیز انسان کا ضعف وافتقار ہے۔ ضعف وافتقار انسان کی صفتِ ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے وہ اپنی ان قوتوں کی بہ دولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے۔ فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیوں کہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں سے کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانونِ طبیعی کی پابند بھی ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور پھر ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے۔ اور یہ تمتع بھی بس ایک مدت تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف وافتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ انتم الفقراء الی اللّٰہ۔

اور دوسری جگہ فرمایا ہے وَاللّٰہ الغنی و انتم الفقراء۔ اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پرواہ نہیں ہوتے، بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داوٗدؑ، حضرت سلیمانؑ، ذوالقرنینؑ اور فاروق اعظمؓ ہیں۔ لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے اِرد گرد دولت کی فراوانی، خدم وحشم کی کثرت اور طاقت وقوت کے کرشمے دیکھ کر

بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور بولہبوں کے ائمۂ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں۔ اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکاء خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤلشکر یا اس کے غیبی شرکاء و انداد، سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہے جس کا دامنِ رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے، ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

(الانعام: ۶۳-۶۴)

''پوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور تری کی تاریکیوں سے۔ تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ اگر اس نے ہم کو رہائی دی اس آفت سے تو ہم شکر گزاروں میں سے بنیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی ہے جو تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم اس کا ساجھی ٹھیراتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّ فَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا

رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّ جَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْا اَنَّهُمْ
اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ
هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ
فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ (یونس:۲۲-۲۳)

"وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں، یہاں تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر ساز گار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں، تند ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف سے گھیرے ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ اگر تونے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ پس جب ان کو نجات دے دی دفعۃً وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی حق کے۔"

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے۔ دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے، وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسنِ انتظام پر مغرور رہتا ہے، اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے سروسامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے، لیکن جب دفعۃً ساز گار ہوا طوفانی بن جاتی ہے، کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پر کاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں، اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہو گی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا، اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جراءت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا، نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہوں، پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سروسامان اور جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا نے ختّار، اور کفور،

عہد شکن اور ناشکر گزار کہا ہے کیوں کہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے ڈھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مامن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا ہے تو وہ کبھی انانیت، خود سری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چناں چہ جوں ہی، اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریبِ اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ۔ (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے، جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے، جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگتے ہیں۔ و لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

توحید کے خصوصی دلائل

دلائل بہ لحاظ مسلّماتِ مخاطب

اوپر کی دو فصلوں میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے۔ ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس وسنن اور فطرتِ انسانی کے اذعانات و مسلمات پر ہے، اس وجہ سے ہر چند، ان کے مخاطبِ اول عرب ہیں، لیکن ان کی حجت تمام بنی آدم پر، بلا امتیازِ عرب وعجم اور بلا لحاظِ کافر ومومن یکساں اور عام ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کی شہادتیں بھی ہر قلب سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہوں، اور ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اب ہم ان دلائل کی توضیح کریں گے، جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے۔ ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے۔ یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے قرآن نے ان کو اپنا لیا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات ولوازم کی تشریح کر کے، مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے۔ استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی و فطری ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساس استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل لغو بات ہے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل ومبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلم ہے۔ انھی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ و متکلمین کو یہ غلط فہمی

ہوگئی کہ قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں اور ایسے برہانیات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان برہانیات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلی دو فصلوں میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

۱-شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے

اس باب میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو ان کے لیے تمھارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے، کیوں کہ اسے تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے مل رہی ہے، لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے ان کی دلیل لانا تمھارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ چہ جائے کہ کسی کو خدا کا دست و باز و قرار دینا۔ پس اگر اس کی کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ۔ رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے۔ اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی۔

وَ مَنۡ یَّدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرۡہَانَ لَہٗ بِہٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنۡدَ رَبِّہٖ ؕ (المومنون: ۱۱۷)

''اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔''

مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اِلَّاۤ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ۔

''تم نہیں پوجتے اس کے سوا مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے ٹھیرا لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔''

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ۔

''کیا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے، جو شہادت دے رہی ہو ان چیزوں کی جن کو وہ خدا کا ساجھی ٹھیراتے ہیں؟''

اہل عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ؕ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (الاحقاف:۴)

''کہو ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ مجھے دکھاؤ کیا چیز ہے زمین کی جو انھوں نے بنائی ہے کیا چیز ہے جس سے آسمانوں میں ان کا ساجھا ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی اور علمی سند، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔''

رہی یہ بات کہ یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن سب کو چھوڑ دیا۔ اور ہجرت کے وقت انھوں نے شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور برأت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے جو ان کے تمام اخلاف کے لیے ہمیشہ نشان راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ؕ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ

اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ○ قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَ كُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ○ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ○ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً ۢ بَاقِيَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (الزخرف:۲۰-۲۸)

”اور کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا ہم ان کو نہ پوجتے۔ ان کو اس کا علم نہیں ہے وہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا ہم نے اس سے پہلے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی وہ اپنے پاس سند رکھتے ہیں؟ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباواجداد کو ایک ڈھرے پر پایا ہے اور ہم ان کے طریقہ پر راہ یاب ہیں۔ اسی طرح ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوش حالوں نے کہا کہ ہم اپنے بزرگوں کو ایک ڈھرے پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کریں گے۔ کہا، کیا اگرچہ میں اس سے زیادہ ہدایت کی چیز لے کر آیا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے؟ بولے جو تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ پس ہم نے ان سے انتقام لیا، پس دیکھو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہا میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو۔ مگر اس سے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پس وہ میری رہبری فرمائے گا۔ اور ہم نے اس اعلان برأت کو ایک یادگار کلمہ بنایا اس کی ذریت میں تاکہ وہ رجوع کریں۔“

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہل عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدوّن سرگزشت جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جاسکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت افسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی۔ خصوصیت کے

ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ تو توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذریتِ ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی اس کلمۂ باقیہ کی روح نہیں پہچانی۔ یہود اس نشانِ راہ کے باوجود بارہا بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراطِ مستقیم سے وہ اس قدر دور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی، اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گڑھ کے کھڑی کر دیں جن سے دینِ بت پرستی کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعاتِ زندگی کا، نیز خانۂ کعبہ کی تعمیر اور مقصدِ تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمھارے اس دعویٰ کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں نہیں پیش کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدوّن سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے۔ اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال

قرآن کے استدلالِ خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم کرتے تھے قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ لوازم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ صفات جو ان مانی ہوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں، نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار سے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خدا کے مسلمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہلِ عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے بلکہ

آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قویٰ اور قابلیتوں کا بخشنے والا موت اور زندگی کا مالک اور مدبرِ امر خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لیے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی اسی کو مانو۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (یونس: ٣٢)

''پس وہی اللہ تمھارا حقیقی رب بھی ہے۔ پس حق کے بعد نہیں ہے مگر گم راہی، تو کہاں بھٹکے جاتے ہو؟''

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک و حاکم اور آمر و ناہی اسی کو مانو۔ اس حق کے بعد جو ثابت ہے، اگر کسی اور کو مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ ضلالت و گم راہی ہے۔ چناں چہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالقِ ارض و سما مانتے ہو لازم ہے اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور کو مالک و حاکم نہ بناؤ۔ جو خالق ہے امر و حکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ.

''بے شک تمھارا مالک وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا۔ آگاہ! اسی کے لیے خلق اور امر ہے۔''

جس اللہ کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو اسی کو رب بھی مانو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے۔ جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے۔ جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف و ایجاد کی بہ دولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو؟ درآں حالے کہ اس کا حق کشف و ایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے۔

اسی طرح خالق کے لیے صفتِ علم کو لازم قرار دیا۔ یعنی جس ذات کو آسمان و زمین

کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیطِ کل مانو اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خلق کیا)

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے، تمام نفع وضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے۔ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ھُوَ وَ اِنۡ یَّمۡسَسۡکَ بِخَیۡرٍ فَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (اور اگر تم کو اللہ کسی نقصان میں پکڑے تو اس کو نہیں دور کر سکتا، مگر وہی۔ اور اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہل عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے۔ یہ بات نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم رسالہ 'حقیقت شرک' میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں، کوئی بری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ اس کائنات کا معمہ حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفات جمال و کمال کی جامع ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے جس سے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا۔

وَ لِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡہُ بِہَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِہٖ ؕ سَیُجۡزَوۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○ (الاعراف:۱۸۰)

''اور اللہ کے لیے اچھی ہی صفتیں ہیں تو انھی صفتوں سے اسے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑو جو اس کی صفات کے باب میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔''

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکاء و شفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے۔ اس عقیدے سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ان کے ان تناقضات کو

نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعہ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟ اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر لوگوں کو نیکوکار اور بدکار ٹھیرائے گا تو اس سے اس کے عدل وحکمت کی نفی لازم آتی ہے۔ اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل واطاعت کافی نہیں ہے بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے ہر بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمتِ عام، اور اس کے غفور وکریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءِ ظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہوسکتا ہے۔

علیٰ ہٰذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھیرانا یا خدا کے کمالِ قدرت کی نفی ہے یا کمالِ غیرت کی۔ کیوں کہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان وزمین کا سنبھالنا مشکل ہو۔ یا پھر وہ بے غیرت ہو کہ اسے اپنے حدود وحقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ لاحق نہ ہو۔ اور الوہیت کا تصوّر ان تمام عیوب ونقائص سے بالکل پاک ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم کے لیے نامناسب ہے یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور اندازِ کلام عموماً مجادلہ کا نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے کیوں کہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے صرف وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ۝ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝ (البقرہ:١١٦-١١٧)

”اور وہ کہتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ وہ پاک ہے بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا، اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔“

یہاں سُبْحٰنَہٗ (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصوّر الوہیت کے تصوّر کے منافی ہے۔ الوہیت کا تصوّر مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفو و برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو، وہ آسمان و زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو، اور اس کی قدرتِ کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لا دے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہومِ الوہیت کے شایانِ شان ہیں اور نہ تمھاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ (یونس:۶۸)

”کہتے ہیں اللہ کے اولاد ہے۔ وہ پاک ہے، وہ مستغنی ہے۔ اسی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ نہیں ہے تمھارے پاس اس کی کوئی دلیل۔“

ایک جگہ اوثان و اصنام کے ضعف و بے چارگی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ الوہیت کے تصوّر کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو خدا کا دست و بازو قرار دو جس کو قوی و عزیز مانتے ہو اور جس کی قوت و عزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ

يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

(الحج: ۷۳، ۷۴)

''اے لوگو! ایک مثل بیان کی جاتی ہے، اس کو غور سے سنو۔ خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے اگر چہ سب اس کے لیے اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو اس سے اس کو واپس نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ناتواں۔ انھوں نے اللہ کی حقیقی قدر نہیں پہچانی۔ بے شک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔''

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِیَآءَ م مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی ط اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰی مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ لا سُبْحٰنَهٗ ط هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ج یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَی النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَی الَّیْلِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ط اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۝ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ ط یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ م بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ قف وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ج وَ اِنْ تَشْكُرُوْا

يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا اِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۝ (الزمر: ۳-۸)

”اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا لیے ہیں، کہتے ہیں ہم ان کو نہیں پوجتے ہیں مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں۔ اللہ نہیں راہ یاب کرے گا، ان کو جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا کہ اپنے لیے اولاد بنائے تو اپنی مخلوق میں سے منتخب کر لیتا جو چاہتا۔ وہ پاک ہے۔ وہ تو ایک ہی اللہ ہے سب کو قابو میں رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ۔ ڈھانکتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ ہر ایک متعین وقت کے لیے چلتا ہے۔ آگاہ! وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ تم کو پیدا کیا ایک جان سے پھر اس کی جنس سے بنائی اس کی جورو اور اتاریں تمھارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ قسمیں۔ پیدا کرتا ہے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے خلقت کے بعد خلقت، تین پردوں کے اندر، وہی اللہ تمھارا رب ہے اسی کے لیے بادشاہی ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ تو کہاں بھٹکے جاتے ہو؟ اگر تم ناشکری کرو گے تو اللہ تم سے بے پروا ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو پسند نہیں کرے گا اور اگر شکر کرو گے تو اس کو پسند کرے گا اور انھیں اٹھائے گی کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ، پھر تمھارے رب کی طرف تمھارا لوٹنا ہے، تو تم کو خبر دے گا تمھارے کیے کی۔ وہ سینوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے پروردگار کو پکارتا ہے اس کی طرف متوجہ ہو کر۔ پھر جب اس کو بخش دیتا ہے اپنی طرف سے نعمت، وہ بھول جاتا ہے اس چیز کو جس کی طرف بلا رہا تھا اس سے پہلے اور اللہ کا شریک بنا لیتا ہے تا کہ اس کے راستے سے گم راہ کرے۔ کہہ دو، اپنے کفر کے باوجود تھوڑا سا متمتع ہو لے، تو جہنم والوں میں سے ہے۔“

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے:

(الف) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اگر ہے تو اس کو پیش کریں۔ اس دلیل کی تفصیل فصل کے شروع میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کے بیٹیاں ہیں، جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے۔ خدا کے لیے اولاد کا تصوّر ہی سرے سے غلط ہے۔ خدا کو واحد اور قہار، قابو (Control) میں رکھنے والا ہونا چاہیے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے بالاتر ہے اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت۔ پھر ستم یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے حالاں کہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ دہری غلطی کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے۔ دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصہ میں وہ اولاد دیتے تھے جس سے خود نفرت کرتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جزا کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدلِ کامل کا ظہور یقینی ہے۔ اس تصوّر کے ساتھ شفاعت کا تصوّر نہیں جمع ہو سکتا کیوں کہ شفاعت کا تصوّر عالم کے بامقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے۔ شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیلِ توافق اور دلیلِ تسخیر (جو اوپر بیان ہو چکی ہیں) سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز و غفار ہے۔ عزیز، یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ غفار، یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔ اس لیے اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ہ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور

پھر نتیجہ نکالا کہ جس نے پیدا کیا، جس نے پرورش کے وسائل مہیا کیے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہی خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو۔ اسی کے ہاتھ میں آسمان وزمین کی بادشاہی ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ ہونا چاہیے۔

(و) اس کے بعد قانونِ عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیاد ڈھادی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کر سکتا نہ شکر کو ناپسند۔ تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر و غضب میں اپنے تئیں مبتلا کرلے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے اپنے عمل پر ہے۔ کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا نہ کفر کو شکر۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

(ز) اس کے بعد اپنے احاطۂ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے، کوئی دوسرا اس کے علم میں کیا اضافہ کرے گا؟

(ح) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیلِ افتقار کے عنوان سے ہم دلائل انفس کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تنزیہات کے بعد خدا کا تصور جس شکل میں دنیا کے سامنے آیا، اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○

(البقرہ:۲۵۵)

’’اللہ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، زندہ ہے اور قائم رکھنے والا۔ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی نہ نیند۔ اس کے قبضہ میں ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون

ہے جو اس کے ہاں بغیر اس کی اجازت کے سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے۔ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور ان کی حفاظت اس پر گراں نہیں ہے اور وہ بلند و بزرگ ہے۔"

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے اور اس میں منزیہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝ (الحشر: ۲۲-۲۴)

"وہ اللہ ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ ڈھکے اور کھلے کا جاننے والا، وہ رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہی اللہ ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ بادشاہ۔ پاک، سکھ، امن دینے والا، معتمد، غالب، عالی جناب، متکبر (غیور)۔ پاک ہے اللہ ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے خلق کرنے والا (ڈیزائنر) وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ہیں ساری اچھی صفتیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔"

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص: ۱-۴)

"کہہ اللہ بے ہمہ ہے اللہ باہمہ ہے، نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا، اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔"

خدا کا یہ تصوّر ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہل عرب کو اقرار تھا۔ قرآن نے یہ کیا کہ جن صفتوں کو اہلِ عرب مانتے تھے ان کے لوازم کو بھی اس نے ان کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو۔ علیٰ ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی مطالبہ کیا کہ ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے سے تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلاشرکت غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے، لازماً وہی رب ہے، اور امر و حکم کا حق اسی کو حاصل ہے، یہ نتیجہ نکالا کہ خفیہ و علانیہ اور امید و بیم ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ مشکلوں کو آسان کرنے والا، خطرات و مصائب کا دور کرنے والا اور امیدوں کو پورا کرنے والا وہی ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (اور اسی کو پکارو بیم ورجا میں)۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ۔

”اے لوگو! اپنے اس رب کی بندگی کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔“

اس بندگی کے لیے جگہ جگہ شرط یہ لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی کرو مخلصین لہ الدین۔ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ عبادت خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، پس اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے)۔

اسی طرح فرمایا جس رب کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ثابت ہے، حمد و شکر کا سزاوار صرف وہی ہے۔ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے شکر گزاری ہے)۔

سورۂ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبتِ حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے، وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ان کو حلال و حرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال و حرام کرنا شرک ہے۔ (دیکھو آیات ۱۶۳-۱۶۹ سورۂ بقرہ)۔

سورۂ نحل آیات (۴۸-۵۹) میں آسمان و زمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ (پس مجھ ہی سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا اَفَغَیْرَ اللّٰہِ یَتَّقُوْنَ (کیا اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو)۔

سورۂ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان و زمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یار و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالہ کیا جائے۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ۔

"کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے کسی اور کو اپنا مرجع بناؤں حالاں کہ وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ کہو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں پہلا حوالہ کرنے والا بنوں اپنے تئیں اللہ کو۔"

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ ط قُلِ اللّٰہُ یَهْدِیْ لِلْحَقِّ ط اَفَمَنْ یَّهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ یُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا یَهِدِّیْٓ اِلَّآ اَنْ یُّهْدٰی ج فَمَا لَکُمْ قف کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ ۝ (یونس:۳۵)

"پوچھو تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ تو کہہ دو اللہ حق کے لیے ہدایت کرتا ہے۔ کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے زیادہ حق دار ہے اس

بات کا کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو ہدایت نہیں پکڑ سکتے الا آں کہ ان کو ہدایت کی جائے؟ تو کیسا فیصلہ کرتے ہو۔"

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو، بندگی اسی کی کی جائے۔ استعانت اسی سے ہو اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)۔

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے دوسرے کو شریک کر کے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع وسفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان ورحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1] جو خدا کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے، وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے۔ جو خدا کو پاک وپاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء وانداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے۔ جو اس کو امن دینے والا مانتا ہے وہ اسی کی پناہ میں چھپے۔ جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسہ کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز وسرفگندہ مانے۔ جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کر کے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے۔ جو خدا ہی کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

---

(۱) جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعاء کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات میں شرکت اور اس کے علم اور عدل وحکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء وصالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کردی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں مدلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز وسرفگندہ کھڑے ہوں گے۔ نیز کوئی شخص بغیر اذن الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا۔ اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی جس سے حق باطل اور باطل حق بن جائے۔ پس انبیاء وصالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ ہم حقیقت معاد میں کریں گے۔ اور بعض ضروری باتوں سے رسالہ حقیقتِ رسالت میں بھی تعرض کریں گے۔

۳-دلیلِ عدل

توحید کے انفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم ثابت کر چکے ہیں، کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکر گزاری، اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعور عدل کو قرآن نے عہد فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہل عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن نے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلماتِ عرب دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہل عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رساں خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر لے جا کر بٹھا دیتے، بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے، غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمھاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے، اسی چیز کو اللہ جل شانہٗ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے۔ حالاں کہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارے میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ فِى الرِّزۡقِ‌ۚ فَمَا الَّذِيۡنَ فُضِّلُوۡا بِرَآدِّىۡ رِزۡقِهِمۡ عَلٰى مَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَهُمۡ فِيۡهِ سَوَآءٌ‌ ؕ اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ‏ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ‌ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَتِ اللّٰهِ هُمۡ يَكۡفُرُوۡنَۙ‏ ۝ وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ رِزۡقًا

مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ۝ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۝ (النحل:۷۱-۷۶)

''اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے تو وہ جن کو فضیلت بخشی گئی اپنی روزی اپنے مملوکوں کو نہیں دے دیتے کہ آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھاری جنس سے بیویاں بنائیں اور تمھاری بیویوں سے تمھارے لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو پاکیزہ چیزوں کی روزی دی تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں؟ اور اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں جو ان کے لیے آسمان وزمین سے ذرہ برابر بھی ان کے لیے نہ رزق پر اختیار رکھتی ہیں اور نہ اختیار حاصل کر سکتی ہیں تو اللہ کے لیے مثلیں نہ بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا اور اس (آزاد) کی جس کو ہم نے اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتا ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہوں گے؟ شکر اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے ہیں۔ اور اللہ مثل بیان کرتا ہے دو آدمیوں کی۔ ایک گونگا ہے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے۔ جہاں اس کو بھیجتا ہے کوئی کام ٹھکانے کا کر کے نہیں دیتا۔ کیا وہ اور وہ شخص جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے راستہ پر ہے، دونوں برابر ہوں گے؟''

یہی اساسِ استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے:

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔

''کیا تمھارے لیے لڑکے ہیں اور اللہ کے لیے لڑکیاں؟ یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔''

اہلِ کتاب اور منافقین

یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم 'حقیقت شرک' میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم یا تو خدا کی صفات کے صحیح تصوّر میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، جو باتیں ان سے متناقض انھوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں۔ اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں ان کو تسلیم کریں۔ ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے اس کی تفصیل ہم ''حقیقت شرک'' میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ محض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح علیہ السلام اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ کسی کے لیے امر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا درحقیقت اس کو رب بنالینا ہے۔ زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس تاریخ سے جس کو وہ مانتے تھے، ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے ہاں جو تقرب و درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا۔ تو انھی کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا؟

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کی خارق عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم آدمؑ

اور یحیٰؑ کی ولادت کو بھی خارق عادت مانتے ہو۔ لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا کیوں کہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں بشریت کی ایک مسلم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارے میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دور کی تھی جس کی تفصیل 'حقیقت شرک' میں گزر چکی ہے۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے "میرا باپ اور تمھارا باپ" قرآن نے اس کی تعبیر "رَبِّیْ وَ رَبُّکُمْ" "میرا رب اور تمھارا رب" سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات نیز انجیلوں کی اصل زبان یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندوں پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا۔ یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اور اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دور ہو گیا تھا۔ لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی۔ ان کے دلوں کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے۔ اس لیے اگر ایک راستہ سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی اس کم زوری کو دور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت و ضعف کے باوجود ان کی فتح و کام یابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی۔ چناں چہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرفگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں۔ تاکہ خدا کی حمد و تسبیح میں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں۔ بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے

ناشکرے انسانوں کے سوا ساری کائنات اس راہ میں سرگرمِ سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بہ ظاہر سنسان نظر آ رہی ہے۔ قرآن مجید میں جو لوگ مسبحات(۱) کی روح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

(۱) مسبحات سے ہماری مراد وہ سورتیں ہیں جو "سَبَّحَ" اور "یُسَبِّحُ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں بالعموم روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنھوں نے زبان سے اقرار پوری توحید کا کرلیا تھا لیکن اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑدلے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ان کی قلت تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آں حضرت (ﷺ) سے بھی رابطہ رکھا جائے اور یہود و نصاریٰ سے بھی ناتا نہ توڑا جائے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کی اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں سائی (Prostration) ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع و فرماں بردار ہیں اور سرمو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں۔ نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کے فرماں برداروں کی تعداد تھوڑی ہے بلکہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی ساری کائنات خدا کی فرماں بردار اور مطیع ہے۔ اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں۔ تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے پلید انسانوں کے سوا جنھوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرّہ اس کے ہم رکاب ہے۔

پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اوپر کی تین فصلوں میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کر دیتے ہیں تا کہ یہ پھیلے ہوئے مطالب بہ سہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آ جائیں۔

(الف) ان تفصیلات سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں، قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ ٹھوس عقلی و فطری دلائل سے بالکل خالی ہے وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءِ ظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں لیکن یہ قرآنی، استدلال کی ایک مخصوص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اصولوں کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے ان مسلمات سے ان پر حجت قائم کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلم ہے۔ باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی ان آیات پر ہے جن کی حجت عربی و عجمی اور عامی و فلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہوا اور اب قیامت تک دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ثابت ہوئی کہ قرآن استدلال ہمارے متکلمین و فلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علۃ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ حل ہوتا، اور نہ ہی وہ خلا بھرتا جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ بسا اوقات اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی استدلال سے

ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے جس نے اپنے ارادہ سے دنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت و رحمت کے ساتھ دنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس طرح سورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دنیا بالاضطرار وجود میں آگئی اور اس سے اضطراراً فیض پا رہی ہے۔ نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو خلق کر کے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ وہ اگر غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا۔ بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلط ہے۔ اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے۔ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرہ اپنی جگہ سے ٹل سکتا نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا۔ نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہو گا تب بھی وہ ہو گا۔ وہ خالق ہے، باری ہے، مصوّر ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمٰن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے، وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکر گزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکر گزاری اور محبت کے تابع ہیں۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو، اسی سے فریاد کی جائے۔ جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دکھ اور سکھ ہر حال میں اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سر و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے۔ نیز یہ بھی ضروری

ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے، یا ان میں دوسروں کی حصہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تا کہ انسان اس کی توحید کا پورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت میں آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنے رسالہ 'حقیقتِ رسالت، پر بحث کریں گے۔ یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرتِ انسانی کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبر ہے، جو تمام صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہے اور اس تمام کائنات پر آمر و متصرف ہے۔ وہی ہمارا مولیٰ اور رب ہے جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے۔ وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیازمندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔ لا الٰہ الا ھو ولا رب سواہ۔

توحید کے اثرات

پچھلی فصلوں میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے۔ انسانی زندگی پر خواہ انفرادی ہو یا جماعتی، اس کے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی وحریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دناءت ورذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے۔ جو چیزیں اس کی تابع داری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابع داری اور اطاعت کرتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے، ان کو اَن داتا، خداوند نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے۔ ان کے لیے ہر طرح کے امر ونہی کا حق تسلیم کرتا ہے، یہاں تک کہ زندوں سے گزر کر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے، ان کو امورِ کائنات میں متصرف، عالم الغیب اور نافع وضار سمجھتا ہے۔ بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنالیتا ہے، اور ہر گھنی جھاڑی، ہر سنسان مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ اور ہر ضرر رساں قوت اور نفع بخش طاقت اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں

کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی۔ وہ یک مرتبہ اپنے مقامِ عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا، یہی حقیقت ہے جو سورۂ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے:

وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخۡطَفُہُ الطَّیۡرُ اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ ۝ (الحج:۳۱)

''اور جو شخص اللہ کا ساجھی ٹھیراتا ہے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا، اس کو چڑیا اُچک لے یا ہوا اُڑا لے جائے کسی دور دراز گوشہ میں۔''

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگا یا وہ اس کی خدمت گزار ہونے کے باوجود یہ ننگ گوارا نہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں۔ ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے لیکن انسان کی دناءت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہوتے کے باوجود ان میں سے ہر ایک کے در کا نقشِ سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسۡجُدُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡہِ الۡعَذَابُ ؕ وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ۝ؕ السجدۃ

(الحج:۱۸)

''کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے انسانوں میں سے بھی، اور بہتیرے ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے۔ اور جس کو اللہ ذلیل کر دیتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔''

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعۃً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا وہ اس دنیا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر

بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آ جاتی ہے۔ اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنے والے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے، جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا، گھڑی بھر پہلے ان کی دناءتِ طبع کا یہ حال تھا کہ میدانِ مقابلہ میں اُترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں۔ وَ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ (سرکار! اگر ہم فتح مند رہے تو مزدوری بھرپور ملے گی نا!) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمھارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں، کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے تمھیں جو کچھ کرنا ہے کر لو، تمھارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے۔ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۝

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ، زندگی ہو یا موت، ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔ پس امید و بیم ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا اور اسی سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے۔ ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محبِ حق ہے اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں ہے۔ باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے، اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی۔ اس کا خزانہ لازوال، اور اس کی زندگی غیر فانی ہے۔ وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا، نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی، وہ ایک سدابہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ
اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ

بِاِذْنِ رَبِّهَاط وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ○

(ابراہیم: ۲۴،۲۵)

’’کیا نہیں دیکھا کس طرح اللہ نے مثل بیان کی ایک مبارک کلمہ کی۔ وہ ایک مبارک درخت کے مانند ہے جس کی جڑیں زمین میں جمی ہوئی ہوں اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ مثلیں بیان کرتا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔‘‘

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت ہر حال میں متوازن رہتا ہے اور تنگی و فراخی کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی۔ نہ وہ گھبراتے نہ مایوس ہوتے، نہ وہ اکڑتے اور نہ وہ فخر کرتے۔ جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔

یہ ایک موحد کا باطن ہے۔ وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح قوانینِ طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اسے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے۔ سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبورانہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں۔ لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور وہ اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے اسی قدر توحید میں کامل ہے۔ راہِ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس زندگی پر اللہ کے قرب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے۔

إِنَّ صَلَاتِي وَ نُسُكِي وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ بِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل و صحیح مساوات وحدتِ آلہ اور وحدتِ آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسانوں نے ساری جغرافی حد بندیاں توڑ ڈالیں، اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا۔ لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے۔ اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حد بندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اسی طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں، لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں۔ ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حد بندیوں کے ذریعہ سے الگ الگ کر رکھا تھا، لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں، اور ساری دنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے۔ جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں وہ اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدن و معاشرت کی عمارت قائم تھی، وہ اصول موجودہ دنیا کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے۔ نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اٹھان ہوئی تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں ان کے خاتمہ کا وقت آ گیا۔ اب دنیا کو ایک نئے نظم (New Order) کی تلاش ہے لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا صحیح جواب کوئی اب تک نہیں دیا جا سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ اب دنیا کو قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت (World State) کی ضرورت ہے جس کی بنیاد عالم گیر انسانیت کے تصوّر پر ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالم گیر انسانیت کا مبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جب کہ قوموں کی افراتفری کا یہ عالم ہے کہ نہ

ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؟ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ انا ولا غیری۔ ہر ایک کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے۔ وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے، بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے، ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سر رشتہ موجود نہیں ہے۔ مشترک سر رشتہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالم گیر قومیت اور ایک عالم گیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہوسکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے (سورۂ نساء کے شروع میں) انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے، مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے اس میں کسی طرح کی حصہ داری نہ ہو۔ اور خاندان کی بنیاد وحدت آدم کے تصور پر رکھی، یعنی تمام نسل انسانی ایک ہی آدم سے ہے، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں حاصل ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے۔ پہلی چیز نے خداؤں اور الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دنیا کو نجات دی، اور دوسری چیز نے خاندان اور نسل ونسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے، عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے۔ سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جدوجہد کا میدان ہے، یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے۔ یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے۔ یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے۔ یہاں ریڈ انڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے۔ اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں

کے منکر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے امن وعدل کے دشمن ہیں، وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں۔ اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دنیا کے لیے نئے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالمِ انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے۔ انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی واطاعت کرے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جاسکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان خواہ وہ کسی قوم ونسل سے تعلق رکھتا ہو بغیر کسی عصبیت کے اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے۔ اس کے اندر فطرتِ انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے۔ آفاق وانفس دونوں میں اس کی ناقابلِ انکار شہادتیں موجود ہیں۔ باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاویِ جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں۔ فطرتِ انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے۔ اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو ہوگا کہ کوشش ناکام ہوگی یا کامیاب ہوگی تو اس کی حیثیت حلق کی پھانس کی ہوگی اور زمین کے ادیان باطلہ میں ایک دین باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

توحید کی اہمیت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی ہے کہ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسم انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اگر دِل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے۔ یہی راز ہے کہ توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ چناں چہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں معاف فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے جس کے لیے چاہے گا معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے، توحید، رسالت، معاد۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو جو خالص توحید کی سورہ ہے ثلثِ قرآن کہا گیا ہے۔ لیکن اگر مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب ''حقیقت رسالت'' میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ لَآ اِلٰهَ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجائے گی کہ آں حضرت ﷺ کو رسول اور زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزوِ لاینفک ہے۔ جو شخص اللہ کو

واحد کہتا ہے لیکن آں حضرت علیہ السلام کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے۔ اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے۔ ہم اپنے رسالۂ حقیقتِ معاد، میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے۔ یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ معاد کی ساری روح توحید ہے۔ جو لوگ معاد کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی شرکاء وشفعاء کو بھی مانتے ہیں، جو ان کے زعم کے مطابق ان کو بخشوالیں گے ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے۔ وہ خدا کے سامنے جواب دہی کی ذمے داری اور اس کے قانونِ عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین۔ چناں چہ اہلِ عرب اور یہود ونصاریٰ کا یہی حال تھا۔ انھوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت وکفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی۔ اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ کیوں کہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے اگر توحید کے تصوّر میں ذرا بھی خلل واقع ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اس جسم کی روح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ موثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں دین فطرت کے احکام وقوانین کی تعلیم دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) سے کیا اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۱) (یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع واحکام درحقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔

---

(۱) دیکھو آیات ۲۲-۲۹ بنی اسرائیل۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا اور اسی نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر سرکنے پر راضی نہ ہوئے۔ مخالفین نے لاکھ چاہا، کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کرلے، ذرا اپنے رویہ میں نرم ہوجائے، کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آجائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کرلیں (وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ) لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہیں کی۔ انھوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا لیکن اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ انھوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو پیش کرسکتے تھے لیکن اسے رام نہ کرسکے۔ معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سروری و سرداری ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں، لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں ان کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش کی گئی۔ جب ان تدبیروں میں ناکام رہے، تو مخالفین نے آخری حربہ اٹھالیا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے خاندان کو، اپنی جائداد و املاک کو، اور اپنے ملک و وطن کو چھوڑیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کرلیا۔ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے، اس میں تمام انبیائے کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں، ان کو پڑھو۔ ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ غور کرو، ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کو چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے؟ بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی۔ اس کے لیے بیویوں نے شوہروں اور شوہروں نے بیویوں سے جدائی اختیار کرلی، عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گل سرسبد تھے، جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلے سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے، محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہوسکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم

دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں (اُقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ)۔ اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے۔ اللہ اکبر! توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اوپر کی مختلف فصلوں میں بیان ہو چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے۔ جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے ظہور میں آ رہی ہیں۔ اور جس کی طرف ہم نے پچھلی فصل میں اجمالی اشارہ کیا ہے۔ بس انبیائے کرام جو یکسر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیوں کر گوارا کر سکتے ہیں جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے، نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، نہ بیوی کو۔ جو چیز بھی اس حق کی ادائے گی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔

بس انبیائے کرام کی ساری جدوجہد کا مقصود توحیدِ خالص کا قیام ہے۔ وہ دنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنا دیں۔ وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالبِ مدد ہوں۔ نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، امید ہو یا بیم، ہر حال میں ان کی نظر اسی کی طرف ہو۔ وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں، اس کی یکتائی تسلیم کریں۔ اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت

کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جزو نہیں ہے بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورہ فاتحہ ہے جس کی اصلی روح خدا کی خالص شکرگزاری اور کامل تفویض وتسلیم ہے۔ اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ تباب میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکز نقطہ توحید ہے۔ اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) رکھ دی گئی ہیں جو شیطان کی آفتوں سے جو خزانۂ توحید کی حفاظت کر رہی ہیں۔ کیوں کہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطہ سے ہٹا دے۔ چناں چہ اسی وجہ سے اس نے کہا لاقعدن لھم صراطک المستقیم (میں ان کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا) یعنی ان کو توحید کے رستہ پر قائم نہ رہنے دوں گا۔ ولا تجد اکثرھم شکرِین (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا)۔ یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔
